سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور ۸۰

عشرۂ محرم اور مسلمانان پاکستان

(دوسرا ایڈیشن)

تحریر
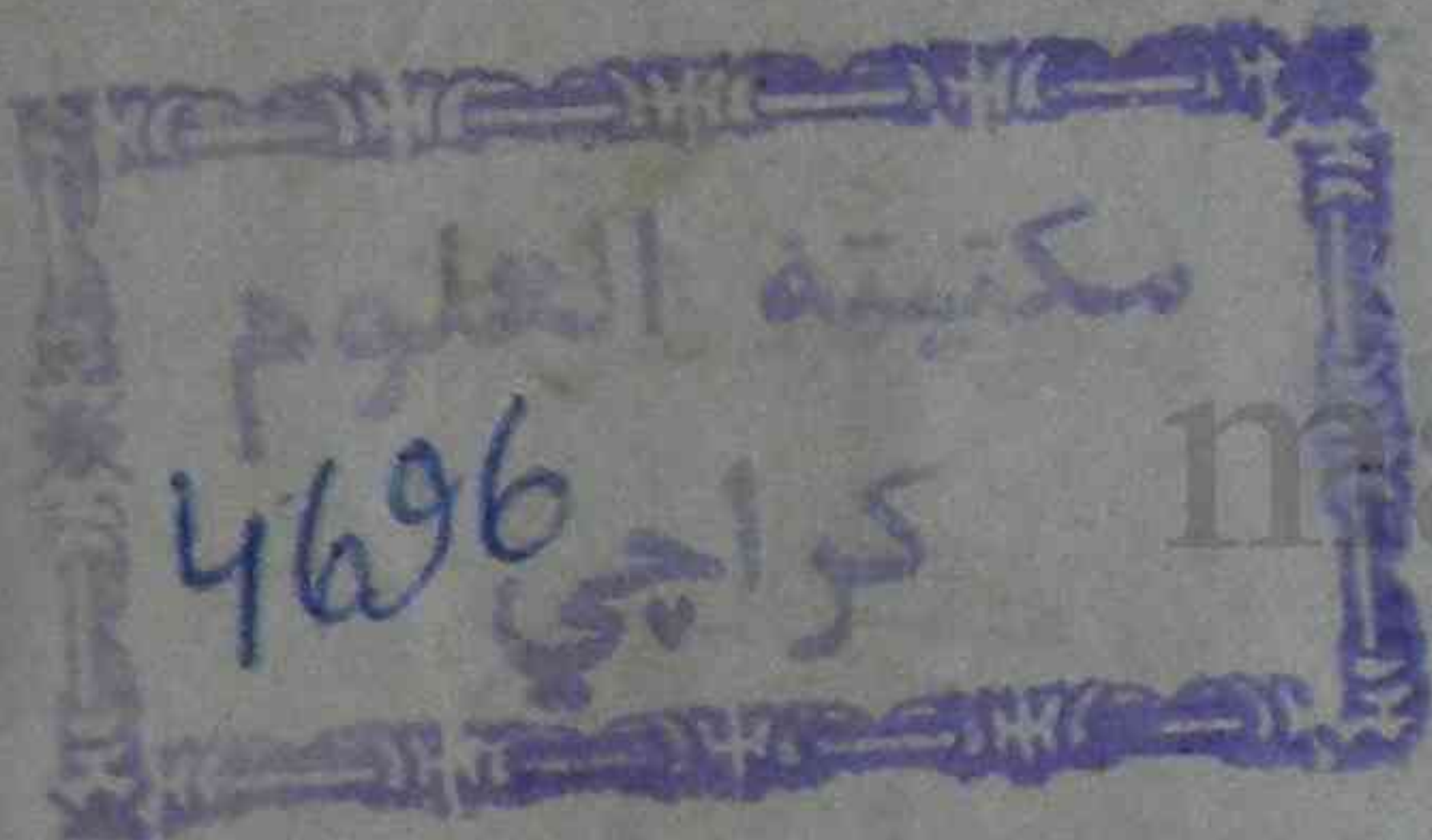
سرکار سید العلماء مولانا الحاج سید علی نقی النقوی صاحب قبلہ

مجتہد العصر مدظلہ العالی

قیمت ۵ آنے

امامیہ مشن پاکستان

کے سلسلہ اشاعت کا رسالہ نمبر ۸۰ "عشرہ محرم اور مسلمانانِ پاکستان" پہلی بار اکتوبر ۱۹۵۷ء میں ایک ناخوشگوار فرض کی حیثیت سے شائع کیا گیا تھا۔ پہلا ایڈیشن ختم ہونے پر دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔

سوادِ اعظم کے ایک مشہور اہلِ قلم جناب ڈاکٹر غلام جیلانی برق صاحب کا ایک مضمون "عشرہ محرم اور مسلمانانِ پاکستان" کے عنوان سے ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور میں ۲۵ اگست ۵۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا جس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے نہایت سکون اور سنجیدگی کے ساتھ واقعہ کربلا کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ باتیں ایسی بھی تحریر ہو گئیں جن کا جواب شائع کرنا ہم نہایت ضروری سمجھتے ہیں تاکہ عوام الناس میں اس مضمون کے بعض مندرجات سے غلط فہمی پیدا نہ ہو جائے۔ ہم سرکار سید العلماء مدظلہ العالی کے بیحد ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنے مخصوص طرزِ نگارش کے مطابق سوقیانہ مناظرہ کی ڈگر سے ہٹ کر اس موضوع پر شیعی نقطۂ نظر کی بڑی خوبصورتی سے وضاحت فرمائی ہے۔

ابنائے ملت کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اس گرانقدر کتابچے کو مشن کے رعایتی نرخ پر خرید کر کے عوام الناس میں مفت تقسیم کریں۔ حسینی فنڈ میں چندہ بھیجنے کی صورت میں آپ کو مرسلہ چندہ سے دوگنی قیمت کے رسائل بھیجے جائیں گے۔

والسلام

جنرل سیکرٹری
امامیہ مشن پاکستان اردو بازار لاہور ۲

جولائی سنہ ۱۹۶ء

(تعلیمی پریس لاہور)

عشرۂ محرم اور مسلمانانِ پاکستان

مذکورۂ بالا سرخی سے ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور کی ۲۵ اگست ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ ہم تو آپ کا نام دیکھ کر بہت ڈر گئے تھے، اس لیے کہ آپ کے قلم کی حرارت آپ کی "دو قرآن" اور "دو اسلام" کتابوں میں اس شدت کے ساتھ ظاہر ہوئی ہے جس سے پوری امتِ اسلامیہ تلملا تلملا اٹھی ہے۔ نیز عبدالماجد صاحب دریا آبادی کے نام آپ نے جو گرم گرم خطوط لکھے ہیں، ان کے شعلے "صدقِ جدید" کے صفحات پر نظر آ رہے ہیں۔ مگر ان تمام اندیشوں کے خلاف آپ کا یہ مضمون کافی سکون اور سنجیدگی کا حامل ہے اور اسی لیے اس کے مندرجات اس کے مستحق معلوم ہوتے ہیں کہ ان پر سنجیدگی کے ساتھ نظر ڈالی جائے شروع میں جناب برق نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

سانحۂ کربلا میں چند حقائق پر مسلمان متفق ہیں کہ:-

۱- حضرت امام حسینؑ حضور پر نور صلعم کے نواسے تھے۔

۲- ان کا کردار نہایت بلند اور مقاصد نہایت عظیم تھے۔

۳- انہوں نے اللہ کی راہ میں تاریخ انسانیت کی سب سے بڑی قربانی پیش کی۔

حضرت ابراہیمؑ نے تعمیل امر اللہ میں صرف حضرت اسمٰعیل کو پیش کیا تھا۔ خود ابو الملت آتش نمرود میں اکیلے کودے تھے حضرت مسیحؑ دار و رسن کی طرف یکہ و تنہا چڑھے تھے۔ لیکن حضرت امام حسینؑ نے کربلا میں سارے خاندان کی قربانی پیش کی تھی۔

۴- یزید بدکردار اور ظالم تھا۔

۵- جب حق کے بالمقابل باطل صف آرا ہو جائے تو باطل کا سر قلم کر دینا یا اپنا سر دے دینا ہی منشائے ایزدی کی تکمیل ہے۔"

مذکورہ بالا باتوں کو تمام مسلمانوں کے متفقہ فیصلہ کی حیثیت سے درج کرنا یہ ثابت کر دینے کے لیے کافی ہے کہ جناب برق صاحب خدانخواستہ بابائے اردو عبدالحق صاحب یا محمود احمد عباسی کے ہمخیالوں میں نہیں ہیں جو کہ مذکورہ باتوں میں سے سوا ایک پہلی چیز (حضرت امام حسینؑ حضور پُرنور صلعم کے نواسے تھے) اور کسی بات کو بھی غالباً تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوں گے۔

اب جناب برق کے ان امور کو بطور مسلّمات قبل میں درج کر دینے سے یہ آسانی ہو گئی کہ موصوف سے بحث و گفتگو میں امور مذکورہ کو "اصول موضوعہ" کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ جن پر بحث کا دار و مدار ہوا کرتا ہے۔

امامیہ مشن پاکستان

مذکورہ بالا مسلمات کو درج کرنے کے بعد جناب برق نے ایک "لیکن" کے ساتھ جو کروٹ بدلی ہے۔ وہ حسب ذیل ہے۔ آپ فرماتے ہیں :-

"لیکن ہماری تاریخ کے اس بے مثال اور قابل صد افتخار واقعہ کو کچھ اس بے سلیقگی سے منایا جاتا ہے کہ فرقہ پرستی کے دطن سوز شعلے بستی بستی بھڑک اٹھتے ہیں۔ قیام امن کے لیے پولیس طلب کی جاتی ہے۔ حکومت دس دن تک خوف سے کانپتی رہتی ہے۔ کہیں ٹیئر گیس استعمال ہوتی ہے تو کہیں مجبوراً گولی چلانا پڑتی ہے۔ جب یہ عشرہ گزر جاتا ہے تو فضا میں تلخیاں ہی تلخیاں باقی رہ جاتی ہیں اور لاکھوں دلوں میں بغض و منافرت کی دھیمی دھیمی آگ مہینوں سلگتی رہتی ہے۔"

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سید الشہدائؑ کے اس ذبح عظیم کا مقصد یہی تھا کہ ان کے جدِ امجد کے پیرو ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے اور انتشار و منافرت کی چنگاریوں کو ہوا دیتے رہیں اگر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور اعمال نتائج سے پرکھے جاتے ہیں۔ اگر تقریبِ محرم کا نتیجہ منافرت کے سوا اور کچھ نہیں تو پھر میرے خیال میں اس کا نہ منانا ہی بہتر ہے۔"

شکریہ صد شکریہ کہ جناب برق نے اصل مقصد کے بتانے میں زیادہ انتظار کی زحمت نہیں دی۔ بلکہ جلد ہی صاف صاف کہہ دیا۔

کہ "مطلب سعدی" کیا ہے۔

جواباً گزارش ہے کہ محرم فقط قلمرو پاکستان ہی میں تو منایا نہیں جاتا۔ بلکہ اس کے بالکل پاس ہی ہندوستان میں بھی صدیوں سے منایا جاتا ہے۔ جہاں غیر مسلم اکثریت برسر اقتدار ہے۔ ایران میں بھی منایا جاتا ہے جہاں برسر اقتدار حکومت شیعہ ہے اور عراق میں بھی جہاں برسر اقتدار سنی ہیں۔ بلکہ دنیا میں ہر جگہ جہاں شیعہ آباد ہیں۔ آخر پاکستان کے علاوہ کہیں بھی عشرۂ محرم ان نتائج کا حامل کیوں نہیں ہوتا؟ جن کی نشان دہی اس مضمون میں کی گئی ہے۔ کہیں فرقہ پرستی کے وطن سوز شعلے نہیں بھڑکتے، کہیں قیام امن کے لیے پولیس طلب نہیں کی جاتی۔ کہیں ٹیئر گیس استعمال نہیں ہوتی، کہیں گولی نہیں چلانا پڑتی۔ کہیں عشرے کے بعد تلخیاں ہی تلخیاں باقی نہیں رہتیں۔ بلکہ ہندوستان میں مشاہدہ تو یہ ہے کہ پرچم حسینی کے نیچے وہ عناصر بھی یکجا ہو جاتے ہیں جو باہم ہر حیثیت سے مختلف ہیں اور آپس میں انتہائی منافرت رکھتے ہیں۔ حسینی مجلسوں اور جلوسوں میں ہندو، عیسائی، پارسی اور سکھ سب مسلمانوں کے دوش بدوش شریک ہوتے ہیں اور کانگرسی، سوشلسٹ اور کمیونسٹ تک کا امتیاز اٹھ جاتا ہے۔ مگر پاکستان میں جس کے قیام کو ابھی قلیل ہی مدت ہوئی ہے۔ بقول جناب برق صاحب "عشرۂ محرم میں فرقہ پرستی کے وطن سوز شعلے بستی بستی بھڑک اٹھتے ہیں۔ قیام امن کے لیے پولیس طلب کی جاتی ہے

حکومت دس دن تک خوف سے کانپتی رہتی ہے ۔ کہیں ٹئیر گیس استعمال ہوتی ہے اور کہیں مجبوراً گولی چلانا پڑتی ہے ۔ اور جب یہ عشرہ گزر جاتا ہے تو فضا میں تلخیاں ہی تلخیاں رہ جاتی ہیں۔"

ظاہر ہے کہ عشرۂ محرم کی عزاداری کا درخت تو تمام دنیا میں ایک ہی ہے اور اس کے پھل وہی سمجھے جا سکتے ہیں جو سب جگہ یکساں طور پر نظر آئیں۔

اب اگر یہ نتائج صرف پاکستان میں نظر آتے ہیں اور یہ صحیح ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" تو یہ سمجھنا ناگزیر ہے کہ پاکستان کی اکثریت کچھ ایسے جذبات اور تصورات کی حامل ہے کہ وہ اقلیت کے ان بے ضرر مراسم کو جو وہ عزائے مظلوم کے سلسلہ میں انجام دیتے ہیں برداشت نہیں کرتی ۔ یہ وہی جماعت ہے جو ہندوستان میں بھی قبل تقسیم عزاداری کے خلاف "شرک اور بدعت" کے نعرے لگا کر طرح طرح کی ننستہ سامانیاں کیا کرتی تھی، مگر اسوقت وہ ایک تیسری طاقت کے برسرِ اقتدار ہونے کی وجہ سے بے بس تھی اب قیامِ پاکستان کے بعد وہ "اموی اور عباسی" اقتدار اور اس کے کارناموں کے تازہ کرنے کے خواب دیکھ رہی ہے اور اس لیے بجبر و تشدد اقلیت کو اس کے حقوقِ مذہبی سے محروم کرنا چاہتی ہے ۔

اس صورت میں یہ نتیجہ نکالنا کہ "عزاداری کا ترک کردینا ہی بہتر ہے" ایسا ہے جیسے بھارت کے کوئی مہاسبھائی مہاشے اس طرح گل افشانی فرمائیں کہ ہندوستان میں مسلمان جو بقرعید مناتے ہیں وہ اس بے سلیقگی سے منائی جاتی ہے کہ فرقہ پرستی کے دلِ سوز شعلے بستی بستی بھڑک اٹھتے ہیں۔ قیام امن کے لیے کہیں پولیس طلب کی جاتی ہے حکومت بقرعید کے چار پانچ دن پہلے ہی سے اور اس کے چار پانچ دن بعد تک یعنی تقریباً دس دن تک خوف سے کانپتی رہتی ہے اور پھر اسکی تان اس پر ٹوٹے کہ چونکہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور اعمال نتائج سے پرکھے جاتے ہیں اگر تقریب بقرعید کا نتیجہ منافرت کے سوا اور کچھ نہیں تو پھر میرے خیال میں اس کا نہ منانا ہی بہتر ہے"

ظاہر ہے کہ "یہ میرے خیال میں" صرف اکثریتی جذبات کا ایک نرم طریقہ اظہار ہی ہوگا اسے کوئی منصفانہ حل مسئلہ کا نہیں سمجھا جا سکتا جسے ان کی قوم کے دوسرے آدمی ڈنڈے کے زور سے منوانا چاہتے ہیں اسی کو وہ ذرا "مسکینی" کے لہجہ میں کہہ رہے ہیں بات وہی ہے کہ اقلیت کو اپنا حق ترک کر دینا چاہیئے اور اکثریت کی خاطر اپنے جذبات مذہبی کی قربانی کر دینا چاہیئے۔ وہی جناب برقؔ کے ارشاد کی نوعیت ہے ورنہ ایسی صورت میں عدل و انصاف کا تقاضا کیا یہ ہوتا ہے جیسا جناب برقؔ نے تجویز کیا ہے۔ کہ "محرم کا نہ منانا ہی بہتر ہے" یا کہ برقؔ صاحب ایسے مفکرین اکثریت کی ذہنیت میں تبدیلی کی کوشش کریں اور حکومت اپنی طاقت سے اکثریت کی چیرہ دستیوں کا سدِ باب کرے تا کہ سید الشہداؑ کی یادگار پاکستان میں بھی اسی امن و سکون کے ساتھ قائم ہوتی رہے جس طرح وہ تمام دنیا میں قائم ہوتی رہتی ہے۔

امامیہ مشن پاکستان

جناب برق صاحب نے عشرہ محرم میں مسلمانوں کے باہمی مناقشہ کا سرچشمہ طرفین کے علماء کو قرار دیتے ہوئے ارشاد کیا ہے کہ ایک طرف اہل سنت کے علماء تردید شیعیت میں فصاحت کے دریا بہاتے ہیں اور دوسری طرف شیعی واعظین سارا عشرہ اس بات کو ثابت کرنے میں صرف کر دیتے ہیں کہ :-

۱۔ اہل بیتؑ مظلوم تھے اور ظالموں میں فاروق و صدیق بھی شامل تھے۔
۲۔ رحلت حضور صلعم کے بعد خلافت کے مستحق صرف حضرت علیؓ تھے۔
۳۔ حضرت فاروق اور صدیق نے اہلبیتؑ کو باغ فدک سے محروم کر دیا تھا۔

اس میں جناب برق نے بڑی انصاف پسندی سے کام لیتے ہوئے سنی اور شیعہ دونوں طرف کے علماء کو ذمہ دار قرار دیا ہے مگر انھوں نے دونوں طرف کے کردار کا جو خاکہ پیش کیا ہے اس میں اُدھر کے جرم کو ہلکا اور ادھر کے جرم کو سنگین کر کے توازن کو ختم کر دیا ہے۔

اہل سنت کے علماء کا جرم تو یہ لکھا ہے کہ وہ تردید شیعیت میں فصاحت کے دریا بہاتے ہیں مگر اس فصاحت کی تفصیل نہیں لکھی ہے کہ وہ فصیحانہ ارشادات کیا کیا ہوتے ہیں بلکہ رد شیعیت سے ایک شخص کے ذہن میں یہ تصور ہو سکتا ہے کہ وہ صرف علمی اور استدلالی انداز سے شیعیت کے ابطال میں فصیح تقریریں فرماتے ہیں اور شیعہ اتنے سر پھرے ہیں کہ اس پر لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ وہ عشرۂ محرم میں اسی عزاداری اور یادگار حسینیت کے خلاف جو شیعوں کی حیات ملی کی شہ رگ ہے پوری طاقت سے مورچہ قائم کرتے ہیں اشتہارات شائع کرتے ہیں رسالے تقسیم کرتے ہیں تقریریں کرتے ہیں جس میں اس کو

شرک و بدعت بتایا ہی نہیں جاتا۔ بلکہ شیعوں کے افعال و اعمال کا مذاق بھی اڑایا جاتا ہے ان کے اخلاق و کردار پر خطرناک بہتان بھی لگائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ علانیہ شیعوں کو کافر و مشرک کہا جاتا ہے، ان کے ایمان بالقرآن کی نفی کی جاتی ہے تقیہ کو جھوٹ اور متعہ کو زناکاری کے نام سے موسوم کر کے حقیقی شریعت اسلامیہ کے قوانین کی توہین کی جاتی ہے۔ اور وہ بھی سوقیانہ لب و لہجہ میں اور اس سے بڑھ کر کہ جہاں بھی موقع ملتا ہے حکام سے کہہ سن کر عزاداری پر پابندیاں لگوائی جاتی ہیں اور جہاں بھی اپنے میں بل بوتا محسوس ہوتا ہے وہاں مسلح ہو کر بزور طاقت روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں خونریزی ہی نہیں بلکہ کبھی وحشیانہ و بہیمانہ کردار سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اسی طرح وہ سورما جو ہندوستان میں تعزیہ داری کو روکنے کے لیے پیپل کی شاخ کاٹنے پر انتہائی اصرار کرتے ہوئے ہندوؤں کے مقابلہ میں برسرپیکار ہو جاتے ہیں۔ وہی تعزیہ داری کو روکنے کیلئے شیعوں کے مقابلہ میں برسرجنگ ہوتے ہیں اور موقع آنے پر خود توہین تعزیہ میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے
دوسری طرف شیعوں کے مجالس کا جو خاکہ دکھایا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیعوں کے یہاں مجالس میں واعظین کا بیان بس اہل سنت کے صدیق و فاروق کو برا کہنے اور فدک اور خلافت کے قصوں میں محدود ہوتا ہے۔ حالانکہ جس شخص نے دو ایک دفعہ نہیں کہ اتفاقاً یوں کہا جائے کہ قسمت سے اسے بھی سننے میں آ گیا ہو بلکہ باستمرار مجالس میں شرکت کی اور تنوع کے ساتھ مختلف بیانات کو سنا ہو وہ اس کی تصدیق نہیں کر سکتا۔

شیعوں کے مجالس کا محوری نقطہ تو مصائب امام حسین کا بیان ہوتا ہے چنانچہ
ایک زمانہ میں تو مجالس کے بیانات اکثر منحصر تھے۔ صرف واقعاتِ کربلا کے دردناک
انداز میں بیان پر ان میں اس واقعہ کے اسباب و علل پر کوئی تبصرہ ہی نہیں ہوتا تھا تو
پھر پچاس برس پہلے کے واقعات یعنی فدک اور خلافت تک پہنچنے کی نوبت کہاں
آسکتی تھی۔ اس کے بعد ذاکری کے ارتقار کا وہ دور آیا جب صاحبانِ علم
نے مصائب کی تمہید میں مضامین و مطالب علمیہ کے بیان کو نصب العین قرار دیا تو اس
کے بعد ترقی کے مختلف درجوں کے ساتھ مجالسِ حسینی کا منبر اپنے سامعین کے
لیے ایک ایسا مدرسہ بن گیا جس میں توحید سے لے کر معاد تک علمِ کلام کے ہر
گوشہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اثباتِ وجودِ باری اس منبر پر ہوتا ہے۔ فلسفۂ
رسالت اس منبر پر بیان ہوتا ہے۔ شانِ رسول اس منبر پر واضح کی جاتی ہے
مختلف انبیاء و مرسلین کے واقعات و حالات اس منبر سے گوش گذار کیے
جاتے ہیں۔ پھر حضرت رسول اکرمؐ کے اخلاق و اوصاف آپ کی سیرت بلند
آپ کے غزوات آپ کی معراج، آپ کی ذاتِ مطہرہ اور سیرتِ حیات پر غیر مسلموں
کی طرف سے جو اعتراضات ہوتے ہیں ان کے جوابات، یہ سب اسی منبر سے ہوتا ہے
حیات بعد الموت، برزخ اور منازلِ قیامت سب کا تذکرہ اسی منبر پر ہوتا ہے
عملی دنیا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام اسی منبر سے کیا جاتا ہے۔
یہاں تک کہ بعض محتاط شیعہ علمار کی نگاہ میں قابلِ اعتراض ہونے کے باوجود
واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی تنظیم و تربیت کا کام تک اسی منبر
سے انجام دیا جاتا ہے۔ اس سب کے ساتھ بلاشبہ کبھی مستقلاً اور

کبھی ضمناً مسئلہ خلافت یا قضیۂ فدک وغیرہ بھی زیر بحث آتا ہے۔
مگر اس کی بنار پر یہ تو کہنا درست نہیں ہے کہ ان مجالس میں واعظین بس اسی کو بیان کرتے ہیں۔ یہ شیعوں کی مجالس سے ناواقفیت ہے یا بہتان طرازی۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ شیعہ علمار کے منبری بیانات مجالس کے بہت سے مجموعے کتابی صورت میں موجود ہیں۔ جیسے نجفِ اشرف کے مشہور عالم اور واعظ علامہ شیخ جعفر شوستری کی کتاب مجالس المواعظ والبکار اور فوائد المشاہد پنجاب میں علامہ شیخ عبدالعلی ہروی کی کتاب مواعظِ حسنہ لکھنؤ میں جناب بحر العلوم السن صاحب قبلہ کی بنار الاسلام خطیب آلِ محمدؐ مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ کی معراج الکلام اور ادارہ "مرکز اصلاح" کی کتابیں، ان کو دیکھا جائے کہ کیا ان میں وہی سب کچھ ہے جو جناب برقؔ صاحب نے لکھا ہے۔ یا اس کے علاوہ اور بہت کچھ ہے؟

ہاں جس طرح علوم وفنون میں آج کل تخصیص کا ایک نظام ہے اسی طرح شیعہ واعظین میں یہ ہوتا ہے کہ بعض افراد کسی، خاص شعبہ کے بیان میں مہارتِ خاص کے مالک ہوتے ہیں اور مشہور ہوتے ہیں جیسے حکیم مرتضی حسینؒ صاحب الہ آبادی مرحوم کہ توحید اور معراج کے بیان میں بڑی شہرت رکھتے تھے: موجودہ دور میں جناب عمدۃ العلمار مولانا سید کلب حسینؒ صاحب قبلہ کی پردہ کے متعلق تقریر خاص شہرت رکھتی ہے۔ اس طرح بعض واعظین مسئلہ خلافت یا عموماً مناظرہ مضامین

خوب بیان کرتے ہیں اور اسی صفت کے ساتھ مشہور ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ لوگ ان کی زبان سے اسی کے مشتاق ہوتے ہیں لہٰذا وہ اسی کو زیادہ تر بیان بھی کرتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ وہ طبقۂ واعظین میں سے صرف بعض افراد ہوتے ہیں۔ ان کے بیانات سے بھی یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جاسکتا کہ شیعوں کی مجلسوں میں بس یہی چیزیں بیان ہوتی ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شیعوں کی مجلسیں مدرسۂ الٰہیات، مدرسۂ اخلاقیات مدرسۂ اجتماعیات اور مدرسۂ تاریخ ہیں۔ جن کی وجہ سے اکثر شیعہ بچوں کو مذہبی اور تاریخی مسائل اتنے معلوم بلکہ محفوظ ہو جاتے ہیں جتنے دوسرے مذاہب کے بڑے بڑے سن رسیدہ افراد کو بھی نہیں ہوتے یہ صرف مجالس حسینی کا فیض ہوتا ہے جو بالکل نمایاں ہے۔

جناب ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ نے شیعہ اور سنی کشمکش کے سلسلہ میں امن و صلح کی اپیل کے طور پر حسب ذیل ارشاد کیا ہے:۔

"میں اہل سنت علماء سے مؤدبانہ پوچھتا ہوں کہ آپ نے گذشتہ تیرہ سو برس میں کتنے شیعوں کو اپنے مواعظ سے ہم خیال بنایا؟ شاید ایک بھی نہیں۔ دوسری طرف آپ کے مواعظ سے گذشتہ تیرہ صدیوں میں بے اندازہ خون ریزی ہوئی۔ ہماری تاریخ کا ہر ورق ان گنت بے گناہ عوام کے لہو سے رنگین ہے آپ کی اشتعال انگیز تقاریر سے بھڑک کر آتش و خون کی

کھولتی ہوئی ندی میں کود پڑے تھے۔ باقی لاتعداد واقعات کو چھوڑ دیجیے صرف ایک واقعہ یاد کیجیے کہ ایران کا ایک فرمانروا اسمٰعیل صفوی ۱۵۰۴ء ۱۵۲۴ء شیعہ تھا، اور سلطنت عثمانیہ کا حکمران (سلیم اول) ۱۵۱۲ء ۱۵۲۰ء سنی، دونوں اپنے اپنے علماء کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے پہلے دلوں میں کینہ و بغض پیدا ہوا۔ پھر ایک دوسرے کو دشنام آلود خطوط لکھے گئے اور بالآخر ۱۵۱۴ء میں جنگ چھڑ گئی۔ اسمٰعیل کی افواج کو شکست ہوئی اور سلیم نے تبریز میں داخل ہوکر پہلے عوام کو تہ تیغ کیا اور ستر ہزار سروں کا ایک مینار تعمیر کرایا۔

اگر شیعہ و سنی تصادم کے تمام واقعات یکجا کیے جائیں تو شاید کئی جلدوں میں نہ سمائیں۔ میں سنی علماء سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ ان ہی المناک واقعات کا پھر سے اعادہ چاہتے ہیں؟ اور شیعی علماء سے پوچھتا ہوں کہ آپ باغ فدک اور خلافت کی بحث کو آج چودہ سو برس بعد چھیڑ کر اور صدیق و فاروق کو غاصب و ظالم ثابت کر کے کون سا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں اگر آپ ٹھوس تاریخی شہادتوں سے یہ ثابت بھی کر دیں کہ باغ فدک اور مسندِ خلافت کے مستحق اہل بیتؑ تھے تو اس کا عملی فائدہ کیا ہوگا؟ کیا یہ باغ اہلبیتؑ کو اب مل جائیگا؟ کیا حضرت علیؓ کو حضرت صدیق کی جگہ مسندِ خلافت پہ آج بٹھایا جائے گا؟ اگر یہ نتائج ناممکن الحصول ہیں تو ان ناگوار مسائل کو چھیڑنے کا مطلب؟"

امامیہ مشن پاکستان

جہاں تک شیعہ سنی اتحاد کا سوال ہے اس کی اہمیت وضرورت سے کسی صاحب عقل وشعور کو انکار نہیں ہوسکتا۔ اور اس لیے کسی فریق کے لیے بھی اشتعال انگیزی اور مفسدہ پروری ہرگز جائز نہیں ہوسکتی مگر اس اتحاد کی یہ شکل درست نہیں ہوسکتی کہ کسی فریق کو مختلف فیہ مسائل یا مختلف فیہ شخصیتوں کے بارے میں اپنے خیالات کے اظہار کا حق ہی نہ دیا جائے۔ جیسا رجحان مذکورہ بالا عبارات کے آخری حصہ میں ظاہر کیا گیا ہے اس سے تو اقلیت کو یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ ہم سے ہماری آزادی تقریر وتحریر کو سلب کیا جا رہا ہے۔ یہ تو اور زیادہ بے اطمینانی کا موجب ہے اور بے اطمینانی بڑھتے بڑھتے بدامنی تک منتج ہوتی ہے۔

شیعی احساسات کے لحاظ سے یہ کہنا بالکل عجیب منطق کی حیثیت رکھتا ہے کہ اب ان باتوں کے بیان سے کیا فائدہ؟

مثال کے طور پر کسی کا گھر لٹ جائے وہ کسی وقت دردمندانہ انداز میں اس کا ذکر کر رہا ہو۔ آپ کہیے اب اس کے ذکر سے فائدہ کیا۔ وہ سامان مل تھوڑی جائے گا؟

اس سے زیادہ یہ کہ کسی کا کوئی عزیز بھائی یا بیٹا مرگیا ہو وہ رو رو کر اس کا ذکر کر رہا ہو اور آپ کہیے کہ اس سے کیا فائدہ۔ اب وہ دوبارہ زندہ تھوڑی ہوسکتا ہے۔

اس اصول کی رو سے تو قرآن مجید پر بھی اعتراض وارد ہوگا کہ اس نے گذشتہ انبیاء ومرسلین کے واقعات کیوں بیان کیے اور ان مظالم کا جو

ان کی قوم نے ان کے ساتھ کیسے کس لیے تذکرہ کیا۔ آخر ابراہیمؑ اور نمرود کے قصہ کے بیان سے کیا فائدہ ؟ کیا اب نمرود مسلمان ہو جائے گا اور جناب ابراہیمؑ کی ایذا رسانی سے باز آجائے گا !

بنی اسرائیل کے وہ تمام بچے جو فرعون نے قتل کروا دیے اب دوبارہ زندہ تو نہیں ہو جائیں گے۔ پھر آخر قرآن مجید میں اس تذکرہ کا حاصل ہی کیا ہے اور اس سب کے پہلے ابلیس نے جو آدم کے سجدہ سے انکار کیا تو بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب نہ آدم پھر پیدا ہوں گے اور نہ ابلیس انھیں سجدہ کرے گا۔ پھر اب بار بار اس کے ذکر سے فائدہ ہی کیا ہے ؟

اگر اس عجیب و غریب منطق سے کام لیا جائے تو ہم سنی بھائیوں سے بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ شیعہ فدک کے مسئلہ پر خواہ مخواہ بحث کرتے ہیں تو اس سے آپ کے خلفاء کو کوئی نقصان تو پہنچ نہیں سکتا۔ اب یہ تو ہونے کا نہیں کہ فدک ان سے چھین کر اہل بیتؑ کو دے دیا جائے پھر آپ کو اس پر تکلیف محسوس کرنے کی ضرورت کیا ہے ؟

اور اگر یہ لوگ ثابت کرتے ہیں کہ آپ کے تینوں خلفاء حق پر نہ تھے۔ تو اب بہر حال اس سے یہ خطرہ نہیں ہے کہ وہ خلفاء تختِ خلافت سے ہٹ جائیں گے اور وہ تخت حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو مل جائے گا پھر اس میں آپ کا کیا حرج ہے ؟ اور آپ اس پر کیوں خفا ہوتے ہیں ؟

ظاہر ہے کہ یہ ہماری منطق کسی سنی کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ

جن کے ساتھ وہ اپنی عقیدت وابستہ کیے ہوئے ہے انہیں بُرا کہنا یقیناً اس کے لیے تکلیف دہ ہونا چاہیئے۔ تو پھر اپنے پیشواؤں پر نفظی طور سے کسی حملہ سے اگر آپ تکلیف محسوس کرتے ہیں تو شیعہ جماعت کے روحانی پیشواؤں کو ان کے علم و یقین میں جنہوں نے نفظی نہیں بلکہ ہر طرح کی روحانی اور جسمانی ایذائیں پہنچائیں۔ ان سے وہ کیونکر تکلیف محسوس نہ کریں گے اور اس تکلیف کا اظہار موقع پڑنے پر ان کی تقریر و تحریر میں کس طرح نہ ہوگا۔ اس کے مقابلہ میں یہ منطق کہ اب اس سے کیا فائدہ؟ کیوں کر قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔

ہاں عقلی طور پر دونوں فریق سے یہ مطالبہ حق بجانب ہو سکتا ہے اور یہی وہ فیصلہ ہے جو غیر جانبدار حکومتوں نے ہندوستان میں کیا اور اب بھی وہی قائم ہے کہ نہ سنّی اپنے جذبات کو سنّی رہتے ہوئے ترک کر سکتے ہیں اور نہ شیعہ اپنے جذبات کو دل سے نکال سکتے ہیں مگر رہنا دونوں کو ایک ہی ملک میں ہے لہٰذا نہ یہ منظرِ عام پر ان کے پیشوایانِ مذہب کو علانیہ بُرا کہیں اور نہ وہ منظرِ عام پر ان افراد کی جو ان کے نزدیک ان کے پیشوایانِ دین پر ظلم ڈھانے والے ہیں مدح کریں یہی وہ عملی سمجھوتا ہے جو ہر متمدن ملک میں باہمی طور پر یا حکومت کے اثر سے ہونا قرین عدل و انصاف ہے۔

برقؔ صاحب کے اب تک کے واعظ و نصیحت کا مطلب تو یہ نکل رہا تھا کہ یہ چودہ سو برس ادھر کی باتیں ہیں۔ اب ان بحثوں میں پڑنے سے

فائدہ ہی کیا ہے۔ مگر آخر میں خود اصول کے پابند نہیں رہے اور اس
چودہ سو برس پہلے والی بحث کے میدان میں اتر ہی پڑے۔ اس طرح
کہ ارشاد ہوتا ہے۔

اگر ہمارے علمار تاریخ پر محققانہ نظر ڈالیں تو یہ حقیقت واضح ہو
کر سامنے آجائے گی کہ ہماری مذہبی تاریخ میں جعلی روایات
موجود ہیں۔ جنگِ صفین کے بعد خوارج کا سلسلہ چل پڑا جن کے
کئی فرقے بن گئے۔ مثلاً اباضیہ، صیفریہ، عجاردہ وغیرہ خود شیعوں اور
سنیوں میں کئی فرقے پیدا ہو گئے اور ہر فرقہ کے رہنماؤں نے کمال یہ
کیا کہ اپنے افکار و عقائد کی تائید میں بہ کثرت احادیث وضع کر
لیں۔ آج ایسی احادیث کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے جن کے
ایک حصّہ پر سنیوں کا قبضہ ہے اور دوسرے پر شیعوں کا۔ ہر ہر فرقہ
اپنے احادیث کی سچائی پہ دھواں دھار تقریریں کر رہا ہے۔ ان
روایات کی بنار پر ایک دوسرے کے گلے کاٹنا۔ اسلاف پر کیچڑ اچھالنا
اپنی تقریروں میں نیش و نشتر بھرنا اور جذبات منافرت سے سارے
ماحول کو مسموم بنانا کہاں تک درست ہے ؟ سینکڑوں اہم کتب
تاریخ میں یہ بھی تو لکھا ہے کہ حضرت علی و صدیق و فاروق رضی اللہ
عنہم کے باہمی تعلقات مہر و ولا نہایت عمیق و استوار تھے ان
روایات کو غلط سمجھ کر صرف ایسی روایات کو صحیح سمجھنا جو ان میں
بغض و عداوت ثابت کرتی ہوں کون سی مذہبی و اخلاقی الجھن کا

اور کس سیاسی و تمدنی مرض کا علاج ہے؟ جب حقیقت آفتاب سے بھی زیادہ واضح ہو چکی ہے کہ تمام اسلامی فرقوں کے ہاں لاتعداد وضعی حکایات و روایات موجود ہیں تو پھر صرف اختلاف والی روایات پر ڈٹ جانا اور اتفاق و محبت والی روایات کو جھٹلا دینا نہ جانے کس منطق و مصلحت کی رو سے صحیح ہے؟ اب دیکھیے جناب برقؔ صاحب علمائے تاریخ کو تاریخ پر محققانہ نظر ڈالنے کی خود ہی دعوت دے رہے ہیں۔ پھر اس ذیل میں کچھ حقیقتیں بیان ہو جائیں تو برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد انہیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ یہ تیرہ چودہ سو برس کی باتیں اب کیوں چھیڑی جاتی ہیں۔

اچھا تو پھر ___ چلیے ___ تاریخ پر محققانہ نظر ڈالیے ___ بیشک یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ ہماری یعنی مسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں جعلی روایات بکثرت موجود ہیں ___ مگر یہ جعلی روایات کے ٹکسال کہاں اور کس غرض سے قائم ہوئے تھے؟ اس کے لیے ابوالحسن علی بن محمد مدائنی کی کتاب الاحداث کا یہ اقتباس کافی ہے کہ:۔ ___

"معاویہ نے تمام عمال کو لکھا کہ جو شخص حضرت عثمان کی فضیلت میں کسی حدیث کو بیان کرے اس کا پورا نام مع پتہ کے میرے پاس لکھ کر بھیج دو اور پوری طرح جائزہ و انعام سے اُسے

مالا مال کر دو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فضیلتِ عثمان میں احادیث کثرت سے ہو گئے اور ایک مدت تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ پھر تمام گورنروں کو لکھا گیا کہ عثمان کی فضیلت میں احادیث کا کافی ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ اب تم دیگر صحابہ کے فضائل میں روایت احادیث کی طرف لوگوں کو دعوت دو اور جو کوئی فضیلت بھی ابو تراب کی نسبت احادیث میں وارد ہوئی ہے اس کے مقابل دوسرے اصحاب کے لیے بھی بیان کرو۔ علیؑ اور ان کے شیعوں کی دلیل باطل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے بس پھر کیا تھا فرمان لوگوں کے سامنے پڑھا گیا اور سیکڑوں حدیثیں صحابہ کبار کے مناقب میں تصنیف ہو گئیں جن کی کوئی اصلیت نہ تھی واعظین ان کو منبروں پر پڑھتے اور معلمین مکتب بچوں کو قرآن کی طرح حفظ کراتے تھے۔ بلکہ لڑکیوں، عورتوں اور غلاموں تک کو یاد کرانا ضروری سمجھتے تھے"۔

جناب ابوہریرہ کے حالات کا مطالعہ کریجیے۔ وہ جنہیں خلیفۂ دوم عمر بن الخطاب نے افراط روایت کے جرم پر درے لگائے۔ جنہیں اکابر صحابۂ رسولؐ ہمیشہ متہم بالکذب سمجھتے تھے۔ انہیں سیاسی مصالح کی بنا پر خلافتِ امویہ میں کتنی عظیم اہمیت حاصل ہو گئی کہ آج جمہور کے کتب احادیث ان ہی کے روایات سے چھلک رہے ہیں۔ اس کے برخلاف دوستانِ حضرت علیؑ ابن ابی طالب کو اپنے موافق حقائق بیان

کرنے میں حکومتوں کے عتاب کا خطرہ تھا۔ جس کے لیے علامہ ابن حجر مکی کا جناب امیرؑ کے بارے میں یہ قول بڑی قیمت رکھتا ہے۔ کہ وہ ایسی ذات ہے جس کے فضائل کو دشمنوں نے عناد سے چھپایا۔ اور دوستوں نے تقیہ سے

مشہور تابعی حسن بصری کا یہ واقعہ یاد رکھنے کا ہے کہ حضرت رسولِ خداؐ سے براہِ راست روایت نقل کرتے تھے۔ اور جب پوچھا گیا کہ آپ نے شعور وامتیاز کی عمر میں پیغمبرؐ کا ادراک نہیں کیا ہے پھر حضرتؐ سے روایات کیونکر نقل کرتے ہیں تو انہوں نے کہا یہ تمام حدیثیں درحقیقت میں نے علیؑ ابن ابی طالب سے سنی ہیں۔ مگر ایسے دور میں میں ہوں کہ ان کا نام نہیں لے سکتا۔ لہٰذا براہِ راست رسولؐ کی طرف اسناد کرتا ہوں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ جمہور مسلمین کے قدیم ترین احادیث اور تفاسیر اور تواریخ کا جو ذخیرہ موجود ہے وہ جمہورِ سلاطین کے زیرِ سایہ تدوین شدہ ہے۔ جب کہ دوستانِ عترتِ طاہرین سخت سے سخت قید و بند کے تکالیف و شدائد میں مبتلا تھے۔ ایسے وقت میں جب کہ یہ خود اپنی تاریخ یا اپنی تفسیر اور اپنی حدیث کے ذخائر کی حفاظت پر قادر نہ تھے۔ اور اس کا ثبوت یہ کہ آج فرقہ شیعہ کے پاس جو ذخیرہ احادیث اور فقہیات کا ہے وہ سب چوتھی اور پانچویں صدی کا تالیف شدہ ہے جب کہ اس کے قبل کی صدیوں میں برابر یہ سخت مشکلات میں بھی خدمات دینی و علمی میں مصروف رہے جیسے پوری جستجو کے ساتھ عراق کے وسیع النظر مجتہد علامہ سید حسنؒ صدر کاظمینی اعلی اللہ مقامہ نے اپنی کتاب

"تاسیس الشیعہ الکرام لفنون الاسلام" میں درج کیا ہے۔ اور اس کا خلاصہ خود ممدوح کے قلم سے "الشیعہ وفنون اسلام" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جس میں ثابت کر دیا گیا ہے کہ تمام علوم وفنون میں تقدم شیعوں کو حاصل ہے۔ پھر یہ تقدم کی واقعیت بس کتب رجال وسیر کے احاطہ میں محدود ہے۔ لیکن وہ قدیم تصانیف اب ہم سے کوئی کہے کہ لا کر دکھاؤ تو ہم ان کے پیش کرنے سے قاصر ہیں یہاں تک کہ اصحاب آئمہ معصومین علیہم السلام کی چار سو کتابیں احادیث کی جو کہ "اصول اربعمائۃ" کہلاتی تھیں آج دنیا سے ناپید ہیں جب ہمارا عالم یہ تھا کہ ہم اپنی کتابوں کے تحفظ سے قاصر تھے۔ تو ہمارے لیے یہ کہاں ممکن تھا کہ ہم اکثریت کے علمی تصانیف پر اثر انداز ہوتے مگر یہ حقیقتوں کا لاشعوری جذب تھا جس نے خود جمہور کی کتابوں کے اندر ان جواہرات کو بھی محفوظ کرا دیا۔ جو مصنوعی خزف ریزوں کے ساتھ درج ہو گئے۔

ہمیں جب چوتھی پانچویں صدی میں زمانہ نے اتنا موقع دیا کہ ہم تاریخ و سیر وغیرہ پر بھی کچھ کام کریں تو ہمارے سامنے اپنا کوئی ذخیرہ تھا ہی نہیں ہمارے سامنے بس وہی سرمایہ تھا۔ جو ہمارے برادران بزرگ کا جمع کردہ تھا۔ اس لیے ہم نے اسی کو اپنے ذوق وبصیرت اور سینہ بسینہ حاصل کیا۔ معلومات کے چھاجوں میں پھٹک پھٹک کر وہ حصہ لیا جو ہمارے نزدیک اصلیت کا جامہ پہنے ہوئے تھا یا جو ہماری حقانیت کے لیے مستند کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر کچھ لاشعوری طور پر اور کچھ کسی خاص تاویل اور

توجیہہ کے تخیل سے ایسے روایات بھی آگئے جن کے کسی حیثیت سے ہمارے خلاف پڑنے کا تصور ہو سکتا ہے۔

یہ دو صورتیں جنہیں ہم نے "لاشعوری" اور تاویل کے تخیل سے تعبیر کیا ہے واضح الفاظ میں یہ ہیں کہ بعض علمار کا تو ذہن ان کے مخالف پہلوؤں کی طرف گیا نہیں اور بعض نے اپنی ذہانت سے کچھ ایسے تاویلات اور توجیہات سوچ لیے جن کے بعد وہ روایات ہمارے خلاف نہیں رہتے بلکہ موافق ہو جاتے ہیں اس لیے انہیں درج کر دیا کبھی یہی وہ چیزیں ہوتی ہیں جن سے ہمارے خلاف استدلال کیا جاتا ہے۔

حالانکہ تاریخی حالات کے اس صحیح جائزہ سے جو اجمالی طور پر ہم نے گذشتہ سطور میں پیش کیا ہے۔ یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وضع احادیث کے اس سیلاب سے جس کا جناب برقی صاحب نے تذکرہ کیا ہے وہ حدیثیں مشکوک نہیں ہو سکتیں جو اقلیت کے نقطۂ نظر کی مؤید ہیں اور وہ اپنے حقانیت کے بے پناہ زور سے سلطنت وقت کے اہتمام و تشدد کے باوجود جمہور کی کتابوں میں درج ہو گئیں۔ بلکہ وہی روائتیں مشکوک ہوتی ہیں جو اکثریت کے نقطۂ نظر کی کسی طرح تائید میں شعوری یا لاشعوری طور پر اقلیت کے لٹریچر میں آگئی ہوں اس کے بعد یہ اپنی اکثریت و اقتدار کے زعم والی ایک دھاندلی ہی سمجھی جا سکتی ہے کہ ہمیں یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ ہم وہ روائتیں قبول کر لیں جو اکثریت کے موافق ہیں۔ اور اکثریت کو رائے نہیں دی جاتی کہ وہ ان ہی احادیث کو تسلیم کر

ہیں جو ان کے جوامع و مسانید میں شیعوں کی موافقت میں موجود ہیں۔
اور جن کے مان لینے سے اختلاف رفع ہو جائے گا۔ اور ملتِ اسلامیہ
کا شیرازہ مجتمع و منظّم ہو جائے گا

کہاں تو جناب برقی صاحب کا یہ موعظہ بالغہ کہ اب چودہ سو برس
ادھر کے واقعات کے چھیڑنے سے کیا فائدہ، اور کہاں ایک دم ان کا خود
اپنے دل کے تقاضے سے مجبور ہو کر یہ فرمانے لگنا کہ :۔

"میرا ایمان یہ ہے کہ حضرت علیؑ کے تعلقات خلفائے ثلاثہ
سے نہایت عمیق اور مخلصانہ تھے۔ کتبِ تواریخ میں بعض شکر رنجیوں
کا ذکر بھی ملتا ہے لیکن یہ شکر رنجیاں محض عارضی تھیں جن کا اثر
مستقل تعلقات مہر و ولا پر قطعاً کوئی نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے کہ
یہ سب اسلام کی حبل متین میں بندھے ہوئے تھے۔ ان کا خدا
ایک، کعبہ ایک، قرآن ایک، رسولؐ ایک، سب کے سب
خواہشاتِ نفسانی سے عاری، اللہ کے سپاہی، بے نفس نہ دنیا کی
لالچ نہ منصب کی خواہش، کھدر پہننے والے۔ ستو اور کھجوریں
کھانے والے، سَو سَو پیوند والے پیراہن پہننے والے سب کچھ اللہ
کی راہ میں دے ڈالنے والے۔ بھلا یہ لڑتے تو کیوں اور ایک
دوسرے سے کھنچتے تو کس مقصد کی خاطر۔"

اب ایمان تو دل کے اندر کی چیز ہے۔ ہمیں کیا حق ہے کہ
ہم آپ کے اس عقیدہ کا اس معنی سے انکار کریں کہ وہ آپ

کا عقیدہ نہیں ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ نہ سب کے دل آپ کے دل کے ایسے ہیں نہ سب کے دماغ آپ کے دماغ کے مثل ہو سکتے ہیں۔

آپ کو یہ حق تو پہنچ نہیں سکتا اور نہ قدرت حاصل ہے کہ آپ اپنے ایمان کو تمام کے دلوں اور دماغوں پر مسلط کر سکیں۔ لہٰذا بہت ممکن ہے اور حقیقت ہے کہ دوسرے بہت سے لوگ آپ کے پاس عقیدے کے خلاف ایمان رکھتے ہیں۔ تو اگر آپ اپنے اس ایمان کو دل کے اندر رکھنا لازم نہیں سمجھتے۔ بلکہ ملاء عام میں روز روشن کی روشنی میں "دلیل و نہار" کے صفحات پر جس کی ہزاروں تک اشاعت ہے اسے شائع کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ تو آپ کی دوسروں پر جو اس کے خلاف ایمان رکھتے ہیں قدغن کرنے کا کہ وہ اپنے ایمان کو کھلے بندوں ظاہر نہ کریں کیا جواز ہو سکتا ہے؟

یہ بڑی مشکل ہے کہ آپ ان مسائل کو چھیڑتے بھی ہیں اور ان پر بحث ہونے سے پھر چڑتے بھی ہیں۔

آپ یہ فرمائیں کہ "میرا ایمان یہ ہے کہ حضرت کے تعلقات خلفائے ثلثہ سے نہایت عمیق اور مخلصانہ تھے۔" اور کوئی دوسرا آپ کے ہاں کی مستند ترین کتاب صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے یہ پیش کرنے کی ہمت نہ کرے کہ:۔

فغضبت فاطمة علی ابی بکر فی ذالک فھجرتہ فلم تکلمت حتی توفیت فلما توفیت دفنھا

زوجھا علی لیلاً ولم یوذن بھا ابابکر وصلی علیھا وکان لعلی بین الناس وجہ فی حیواۃ فاطمۃ فلما توفیت استنکر علی وجوہ الناس فالتمس مصالحۃ ابی بکر۔

جائدادیں ضبط ہوں، مظلوم کے تاثرات کی یہ حد پہنچے کہ وہ عمر بھر بات نہ کرے — فریقِ مخالف کی جنازہ پر شرکت تک گوارا نہ کی جائے۔ بعیت یعنی تسلیم حکومت سے علیحدگی رکھی جائے اور بقول بخاری جناب فاطمہؑ کی وفات کے بعد مجبوراً مصالحت کر لی جائے۔ یہ سب آپ کے نزدیک شکر رنجی ہے اور اس کے بعد بھی تعلقات نہایت عمیق اور مخلصانہ رہتے ہیں تو پھر کشیدگی اور نزاع اور اختلاف کس چیز کا نام ہوتا ہے۔

پھر اگر کسی نے مزید تلاش کر لی اور اسے متعدد معتبر تاریخوں میں دروازے پر لکڑیاں جمع کرنا اور آگ لگانے کا اہتمام مل گیا اور اس موقع کی درشت کلامیوں پر نظر پڑ گئی تو وہ کس طرح آپ کے دل کے ایمان کو اپنے دل و دماغ کے اندر جذب کر سکتا ہے؟ اس کا حل پھر وہی ہو سکتا ہے کہ آپ کا ایمان آپکے ساتھ اور ہمارا ایمان ہمارے ساتھ یعنی لکم دینکم ولی دین۔

اس زمانہ میں اگر روایت سے زیادہ درایت پر اعتماد کیا جاتا ہے تو دیکھ لیجئے کہ وہ جو پیغمبر خداؐ کے دور میں ہر جہاد کا فاتح ہے اس دور میں روم وایران کے فتوحات والے "جہادوں" میں بھی

کہیں نظر آتا ہے؟ اور اگر نہیں اور واقعہ یہ ہے کہ کہیں نہیں، اب تو ہر جگہ خالد بن ولید ہیں، ابو عبیدہ جراح ہیں، سعد بن ابی وقاص ہیں کہیں بھی علی ابن ابی طالب نہیں ہیں، تو یہی اس کے سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ وہاں بس کبھی کبھی کی وقتی شکر رنجی تھی یا کوئی مستقل نزاع یا اصولی اختلاف۔

اگر علمی مہمات کو دیکھا جائے تو جمع قرآن کی ایسی مہتم بالشان مہم اور ایسے اس کاوش کے ساتھ انجام دیا گیا کہ دو دو صحابیوں سے گواہیاں لے لے کر آیتیں درج کی گئیں۔ زید بن ثابت ایسے نوعمر صحابی کے خدمات حاصل کیے گئے مگر اسے نہیں بلایا گیا جس کا علم قرآن مسلم تھا اور جسے علی مع القرآن والقرآن مع علی کی سند حاصل تھی۔ کیا یہ کسی معمولی شکر رنجی ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟

تفسیر قرآن میں علمی تشنگی کو کعب الاحبار اور عبد اللہ بن سلام ایسے نومسلم یہودیوں کی مدد سے دور کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کا ذخیرہ تفسیر "اسرائیلیات" کا مجموعہ بن جاتا ہے مگر اس ذات سے استفادہ عار سمجھا جاتا ہے۔ جسے حضرت پیغمبر خدا انا مدینۃ العلم وعلی بابھا کے الفاظ میں مرکز علم قرار دے چکے تھے۔

کیا یہ صرف شکر رنجی کہی جا سکتی ہے جس کی بنیاد پر اتنے بڑے علمی خسارے گوارا کر لیے جائیں۔ مگر اس کی شخصیت کی اہمیت کا اعتراف کرنے سے گریز کیا جائے؟

یہ آپ کی منطق کہ "ان میں اختلاف ہوتا بھی کیسے کہ یہ سب اسلام کی جبل متین میں بندھے ہوئے تھے، ان کا خدا ایک، کعبہ ایک، قرآن ایک رسول ایک، سب کے سب خواہشاتِ نفسانی سے عاری، اللہ کے سپاہی، بے نفس، بے غرض، نہ دنیا کی لالچ نہ منصب کی خواہش، کھدر پہننے والے ستو اور کھجوریں کھانے والے، سو سو پیوند والے پیرہن پہننے والے، سب کچھ اللہ کی راہ میں دے ڈالنے والے، بھلا یہ لڑتے تو کیوں اور ایک دوسرے سے کھنچتے تو کس مقصد کی خاطر؟"

اللہ اکبر، زورِ قلم اتنا تو ہو کہ ملاءِ اعلیٰ کے کروبین کی تصویر کھنچ گئی۔

گستاخی معاف! یہ صحابہ کرام کے اوصاف کا مرقع جو کھینچا گیا ہے اس میں انصار کا بھی حصہ تو ہونا چاہیئے۔ کہ وہ شرف صحابیت سے مشرف ہیں۔ بدر و اُحد کے مجاہدین ہیں۔ وہ ہیں جنھوں نے اپنا گھر بار، مال و اولاد سب پیغمبر اسلام کے قدموں پہ نثار کر دیا۔ پھر آخر رسولِ خدا کی وفات کے ساتھ ہی جب کہ ابھی جسدِ مبارک دفن بھی نہ ہوا تھا، یہ سقیفہ بنی ساعدہ میں معرکہ آرائی کیوں ہوئی؟ حضرت سعد بن عبادہ کی خلافت کا منصوبہ کس لیے بن گیا؟ پھر فرض کر لیجیے کہ انصار ان جوہروں سے عاری تھے تو آپ کے مہاجرین اوّلین نے ہی بے غرضی سے کام لیا ہوتا کہ تختِ خلافت پر ان ہی کو قابض ہو جانے دیتے۔ بقول آپ کے انھیں تو نہ دنیا کی لالچ نہ منصب کی خواہش۔ کھدر پہننے والے ستو اور کھجوریں کھانے والے، سو سو پیوند والے پیرہن پہننے والے سب کچھ

اللہ کی راہ میں دے ڈالنے والے" پھر آخر کون آفت آرہی تھی کہ جنازۂ رسولؐ تک کو چھوڑ دیا اور فوراً سقیفۂ بنی ساعدہ میں پہنچنا ضروری سمجھا گیا۔ پھر وہاں ان "فرشتگان قدس" کے جوڑ توڑ، اچھے دار تقریریں ہی نہیں بلکہ اوس و خزرج کی زمانہ جاہلیت کی رقابت کے جذبات کو ابھارنا اور اس سے فائدہ اٹھانا اور اس کے بعد "مشاجرۂ لفظی" ہی نہیں بلکہ ہاتھا پائی اور نوچا کھسوٹی تک نوبت پہنچا یہ سب آخر کیا تھا؟

اگر کہیئے کہ امر خلافت میں یہ اختلاف کسی دنیوی غرض سے نہ تھا بلکہ یہ مفادِ دینی کے مانعت انصار کی خلافت کو درست نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے یہ سب کچھ ہوا تو پھر حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے اختلاف کو بھی وجہ دینی پر مبنی کیوں نہیں قرار دیا جاتا اور ان کے زہد و تقویٰ وغیرہ کو پیش کر کے اس نزاع و اختلاف کی نفی کیوں کی جاتی ہے؟

افسوس ہے اس ذہنیت پر کہ ان کو بے نفس، بے غرض وغیرہ دکھانے کے ساتھ پھر ان کی باہمی رشتہ داریاں دکھائی جا رہی ہیں۔ کیا کسی بے نفس و بے غرض ہستی کو اصولی اور دینی اختلاف سے رشتہ داریاں سدِ راہ ہو سکتی ہیں؟ دیکھ رہے ہیں کہ حلالِ خدا کو حرام اور حرامِ خدا کو حلال کیا جا رہا ہے۔ اذان و نماز میں سنتوں پر قدغن ہو رہا ہے اور بدعتوں کی ترویج ہو رہی ہے۔ اور پھر تیسرے دور میں تو ذاتی قرابتوں پر پورے تمدنِ اسلامی کے تقاضوں کو قربان کر دیا جاتا ہے۔ اور پھر کچھ واقعی اور کچھ مفروضہ رشتہ داریوں کی بنا پر یہ سمجھا جائے کہ ان کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ تو اس سے بڑھ کر ان کی

بے نفسی، بے غرضی اور بے لوثی پر حملہ ہی کیا ہو سکتا ہے؟

مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ کہاں مضمون کی یہ سرخی کہ عشرۂ محرم اور مسلمانانِ پاکستان" اور کہاں اس کے ذیل میں صدرِ اسلام کے یہ تلخ تذکرے! مگر اس کی سراسر ذمہ داری جناب ڈاکٹر برق پر ہے۔ ورنہ دنیا کو معلوم ہے کہ میں اتحاد بین المسلمین کا کتنا حامی ہوں۔ اور بالخصوص عزائے حضرت سید الشہدا امام حسین علیہ السلام میں اسی نقطۂ نظر کا حامی ہوں کہ اسے تمام مسلمانوں کے اشتراک کے انداز پر ہونا چاہیئے۔ اور نزاعی مسائل کو اس کے اندر داخل نہیں ہونا چاہیئے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ایک فریق اس موقع پر اپنی ممدوح شخصیتوں کی مدح و ثنا کا جواز حاصل کرے اور پھر بھی اس کی مقابل حقیقتیں سامنے نہ لائی جائیں۔ یہ اپنے جذبات ہی کا خون کرنا نہیں ہے۔ بلکہ حقائقِ تاریخ اور حقائقِ دین دونوں پر ایک ظلم ہے۔

پھر بھی ہم نے اس محل پر مجمل اشاروں پر اکتفا کی ہے۔ اور اسکی تفصیل اور مکمل حوالوں کے ساتھ اثبات کو جس میں مناظرانہ انداز پیدا ہو جانا اس موقع پر چھوڑا ہے کہ جب جناب برق صاحب اپنے مداحین کی نادان دوستی میں دھاندلی سے کام لے کر ان حقیقتوں کا انکار فرمائیں۔ خدا کرے اس کا موقع نہ آئے۔

وہ لیجیے جناب برق صاحب اپنے ایمان اجمالی کے بعد کہ "حضرت علی کے تعلقات خلفائے ثلثہ کے ساتھ مخلصانہ تھے" تفصیل کے میدان میں آگئے اور اب خالص مناظرانہ پارٹ ادا کرتے ہوئے

بالکل وہی سب کہنے لگے جو ہمیشہ مولوی عبدالشکور صاحب لکھنوی موافق مناظرہ میں اور صفحات النجم وغیرہ پر کہتے آئے ہیں اور جس قسم کی بہت سی باتوں کو جمع کر کے انھوں نے اپنے ادارہ "النجم" سے "ابوالائمہ کی تعلیم" نامی رسالہ شائع کیا تھا جس کے بعد امامیہ مشن لکھنؤ سے "ابوالائمہ کی تعلیمات" رسالہ منظر عام پر آیا۔ اب جناب برق صاحب ایسی ہی باتوں کو لیل و نہار کے صفحات پر لا رہے ہیں۔

پہلی بات

"وہ قرابت کے بندھنوں سے بندھے ہوئے تھے۔ صدیق و عمر حضور صلعم کے سسر تھے اور عثمان و علیؑ داماد پھر حضرت ابوبکر کی وفات کے بعد ان کی زوجہ اسماء سے حضرت علیؑ نے عقد کر لیا تھا اور ایک بیٹی ام کلثوم (معاذ اللہ) حضرت عمر کے عقد میں دے رکھی تھی۔"

اب کون برق صاحب کے دل میں ڈال کر ان کو یہ سمجھا سکتا ہے کہ ایک شیعہ کے لیے ام کلثوم کو بنتِ علیؑ و فاطمہ فرض کر کے خلیفۂ دوم کے ساتھ ان کے عقد کا غلط فسانہ اس سے زیادہ دل آزار ہے۔ جتنا آپ کے لیے فدک وغیرہ کا واقعی تذکرہ اور اس کے ثبوت میں آپ نے شیعوں کی کتاب حدیث تہذیب الاحکام سے جو روایت نقل کی ہے وہ خود اس کا ثبوت ہے کہ وہ ام کلثوم جنھیں بنتِ علیؑ سے تعبیر کیا ہے دخترِ علیؑ و فاطمہؑ نہ تھیں۔ اس لیے کہ اس روایت میں یہ ہے کہ ان کا اپنے بیٹے زید بن عمر کے ساتھ ہی انتقال ہو گیا تھا۔ اور وہ ام کلثوم جو دخترِ حضرت علیؑ و فاطمہ علیہم السلام تھیں بلاشبہ واقعۂ کربلا تک موجود تھیں

جبکہ یہ معلوم ہے کہ ام کلثوم بنت ابی بکر خلیفہ دوم کے عقد میں تھیں اور خود آپ نے ابھی ذکر کیا ہے کہ خلیفہ اوّل کی بیوہ اسماء بنت عمیس کے ساتھ حضرت علیؑ نے عقد فرمایا تھا۔ اس لیے محمد بن ابی بکر بھی آپ کے ربیب ہونے کی بناء پر آپ کے بیٹے کہلاتے تھے۔ اور اسی طرح آپ کی بہن ام کلثوم بھی اب اس کے بعد آپ کا اس رشتہ کو حضرت ام کلثوم بنت علیؑ سے وابستہ کرنا زیادتی نہیں تو اور کیا ہے؟

اب آپ نے تو دل دکھا دیا۔ وہ کوئی بات نہیں اور اگر کہیں آپ کے ان رشتوں کے جواب میں یہ کہہ دیا جائے کہ جتنے یہ آپ نے بیان کیے ہیں۔ سب ابوسفیان ہی نہیں بلکہ مشرک ابولہب اور یہودی حی بن اخطب کے ساتھ بھی وابستہ تھے۔ لہٰذا آپ کی منطق کی رو سے جنگ صفین میں حضرت علیؑ اور معاویہ کی باہمی معرکہ آرائی کو بھی بے اصل ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وہ قرابت کے بندھنوں میں بندھے ہوئے تھے اور حی بن اخطب کے بعد اسکی بیٹی سے رسول اللہؐ نے عقد فرمایا تھا لہٰذا پیغمبرؐ کی اس سے بھی کوئی نزاع درست نہیں ہو سکتی۔ اور آپ کے تاریخی روایات کے مطابق رسولؐ کی دامادی اسکے رشتہ میں ابولہب کے فرزند بھی منسلک تھے۔ لہٰذا اس کے بعد تو توحید اور شرک کا بھی اختلاف ختم ہی معلوم ہوتا ہے ذرا خود ہی غور کیجیے یہ کتنی مضحکہ خیز منطق ہے۔

دوسری بات فروع کافی کے حوالہ سے لکھا گیا ہے کہ:۔ حضرت امام جعفرؑ کی ایک طویل حدیث منقول

ہے جس میں ابوبکر و ابوذر غفاری اور سلمان فارسی کا ذکر ہے۔ اور آخری جملہ یہ ہے۔ ومن ازھد من ھؤلاءِ۔ ان تینوں سے بڑا پرہیزگار کون تھا۔

اب ذرا یہ عنوانِ نقل ملاحظہ ہو۔ فروع کافی آپ جانتے ہیں ؛ یہ نام ہے طہرانی چھاپے کے بڑے سائز کی دو جلدوں کا جو تقریباً ایک ہزار صفحات کی ہیں۔ ان میں سے یہ حدیث کس جلد میں اور کس صفحہ پر ہے پھر اس مہمل حوالہ کا سوا اس کے کیا فائدہ ہے کہ اگر کوئی مکمل ورق گردانی کر کے تلاش بھی کرے اور اس حدیث کو نہ پائے تب بھی اپنی آنکھوں پر تہمت رکھے کہ اتنی بڑی کتاب میں کہیں ہو گی، میری نظر نہ پڑی ہو گی۔

پھر روایت اگر موجود بھی ہو تو اس کی روایتی حیثیت کیا ہے ؟ مرسل ہے مسند ؟ مرفوع ہے یا مقطوع ؟ سند متصل ہے یا صحیح ؟ حسن ہے موثق ہے یا ضعیف ؟ اس کے بعد ہی منزل ہے کہ متن حدیث پر نظر کی جائے سیاق کو دیکھا جائے مخاطب پر نظر ڈالی جائے کہ کس مسلک کا شخص ہے پھر جو نام لیے گئے ہیں وہ کلام امام میں ہیں یا کلام راوی ہیں محل ورود بھی دیکھا جائے کہ کیا ہے ؟ ایک تو صورت یہ ہوتی ہے کہ اصحاب رسول م کے اوصاف بیان ہو رہے ہیں اور ان کی قدر و منزلت کی تعیین ہی موضوع گفتگو ہو۔ یہاں پر اگر یہ ذکر اس طرح ہوا ہو تو اس کا خاص وزن ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بعد والے مسلمانوں کی دنیا طلبی اور اس کے بالمقابل اضافی طور پر سابق زمانہ والوں کی سادہ زندگی کا ذکر ہو وہاں یہ فقرہ آئے تو اس کا دوسرا مرتبہ ہے۔

سوا انتہائی متعصب اور جھگڑالو قسم کے افراد کے ذرا بھی سنجیدہ اور معاملہ فہم شخص

ہو تو وہ ہر ہر موقع پر اپنے اصولی یا مذہبی اختلاف کا اعلان نہیں کیا کرتا۔ آج مجھ سے بھی کسی سنی دوست سے گفتگو ہو رہی ہو اور وہ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کے انقلابات کا ذکر کرتے ہوئے ضمناً جناب سلمان اور ابوذر رضوان اللہ علیہما کے ساتھ کوئی نام لے دیں تو میں ان سے اس موقع پہ الجھنے کی کوشش نہ کروں گا کہ تم نے ان ناموں کے ساتھ یہ نام کیوں لے لیا؟ بلکہ مجموعی طور پر یہ کہہ دوں گا کہ ان لوگوں میں جیسا زہد و ورع تھا ویسا اب کہاں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ میں ان شخصیتوں میں سے ہر ایک کے متعلق مخاطب کے نقطۂ نظر سے بالکل متفق ہی ہوں پھر اس کے بعد یہ بھی قابلِ غور بات ہے کہ کیا مطلق زہد واقعی بلند صفت ہے؟ جب کہ احادیث سے پتہ چلتا ہے اور علمائے اخلاق نے بھی لکھا ہے کہ کبھی زہد فی الدنیا للدنیا بھی ہوتا ہے۔

یہ اس مفروضہ پر ہے کہ یہ حدیث واقعی وجود رکھتی ہو اور معتبر ہو حالانکہ حقیقتاً ایسا ہے ہی نہیں اس کے برخلاف فروع کافی میں امام جعفر صادقؑ کا جو مکالمہ ابن ابی لیلیٰ قاضی سے ہے اس میں بڑے لطیف عنوان سے سیرت شیخین پر عمل کرنے کو منع کیا ہے۔ چنانچہ اس میں ہے کہ حضرت نے ابن ابی لیلیٰ سے پوچھا کہ تم فیصلے کس چیز سے کرتے ہو؟ انھوں نے کہا بما بلغنی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وعن علیؑ وعن ابی بکر و عمر، "جو مجھے رسولِ خداؐ کی طرف سے پہنچتا ہے اور حضرت علیؑ اور ابوبکر و عمر کی طرف سے"۔ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ "ہم تک یہ حدیث بھی پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ان علیاً اقضاکم" انھوں نے کہا بے شک یہ حدیث پہنچی ہے۔ امام نے فرمایا۔ پھر تم حضرت علیؑ کے

فیصلہ کے سوا کسی اور کے فتوے کی رو سے کیونکر فیصلہ کرتے ہو (فروع کافی ج ۲ ص ۳۵۷)
حالانکہ مخاطب کے مذہب و مسلک کو سامنے رکھتے ہوئے اصولی اختلاف کو یہاں بھی نمایاں نہیں کیا گیا ہے۔ پھر بھی اس سے حضرت امام جعفر صادقؑ کا صحیح نقطۂ نظر ابوبکر و عمر کی نسبت ظاہر ہے اس کے بعد حضرت کی طرف کسی ایسے قول کی نسبت کہاں درست ہو سکتی ہے جو بنیادی طور پہ مذہب جعفری کے خلاف ہو۔

تیسری بات

لکھا ہے کہ حضرت باقرؑ کا ارشاد ہے لست بمنکر فضل ابی بکر و لست بمنکر فضل عمر و لکن ابا بکر افضل
"میں ابوبکر و عمر کی فضیلت سے منکر نہیں بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ ابوبکر کا درجہ بلند تر تھا"
اس میں کتاب احتجاج کا حوالہ دیا گیا ہے اور غالباً خود مضمون نگار کو بھی کسی اور کے حوالہ پر پورا بھروسا ہو گیا اس لیے جرأت کر کے صفحہ بھی درج کر دیا گیا یعنی صفحہ ۲۰۴ جس کے لیے ہم شکرگزار ہیں کہ ہمیں تلاش میں آسانی ہو گئی۔ اب نتیجہ تلاش کے سننے کے پہلے ذرا احتجاج کی نوعیت اور اس کی ترتیبی کیفیت سن لیجیے۔
کتاب احتجاج ان مناظرات کا مجموعہ ہے جو معصومین علیہم السلام اور ان کے اصحاب نے مخالفین مذہب سے کیے ہیں اس کی ترتیب باعتبار ترتیب معصومین علیہم السلام ہے یعنی سب سے پہلے جناب رسالت مآبؐ کے مناظرات ہیں اور پھر یکے بعد دیگرے دوسرے معصومین کے، اب چونکہ مناظرہ میں مخاطب مذہب ہی ہوتا ہے اور مقام مناظرہ وہ ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام الیا علم بردار توحید استفہام یا محاشاۃ خصم وغیرہ کے طور پر متعدد معبودان باطل کے لیے باری باری ھذا ربی کے الفاظ تک کہہ دیا کرتا ہے۔ اس لیے قبل تلاش

کوئی بعید بات معلوم نہیں ہوتی کہ امام محمد باقر علیہ السلام کی زبانِ مبارک پر کسی مناظرہ کے موقع پر کسی حیثیت سے یہ الفاظ جاری کیے ہوئے ہوتے جن سے اصل مقصود مخالف کو قائل کرنا ہوتا مگر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ہم نے کتاب کے صفحہ ۲۰۴ پہ نظر کی اور یہ دیکھا کہ یہاں امام باقرؑ کے مناظرات کا ذکر ہی نہیں ہے بلکہ اس صفحہ پر امام موسیٰ کاظمؑ کے مناظرات ختم ہوتے ہیں اور آخری سطر سے امام رضاؑ کے مناظرات شروع ہوئے ہیں۔ حوالہ کے غلط ہونے کے لیے تو اتنا ہی کافی ہے مگر ہم نے امام محمد باقرؑ علیہ السلام کے مناظرات پر بھی نظر کی، جو ص ۱۶۷ سے ص ۱۷۳ تک تقریباً ۶ صفحات میں ہیں مگر ان میں بھی کہیں مذکورہ الفاظ نظر نہیں آئے۔ ہاں اگر گفتگو میں حضرت امام باقرؑ علیہ السلام کی زبان پر خلفائے ثلاثہ کا نام آیا ہے۔ مگر وہ اس طرح کہ حضرت نے فرمایا۔

ما اکثر ظلم کثیر من ھٰذہ الامۃ لعلی ابن ابی طالب واقل انصافھم لہ یمنعون علیاً مالعطونہ سائر الصحابۃ وعلی افضلھم فکیف یمنع منزلۃ لعطوننا غیرہ۔	اس امت کی اکثریت حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے ساتھ ظلم کرتی اور کتنا کم انصاف کرتی ہے کہ وہ حضرت علیؑ سے وہ سلوک بھی نہیں کرتی کہ جو وہ دوسرے صحابہ کے ساتھ کرتی ہے حالانکہ حضرت علیؑ ان سب سے افضل ہیں

تو پھر کیوں جتنا دوسروں کے ساتھ کیا جاتا ہے اتنا بھی آپ کے لیے نہیں کیا جاتا۔ کسی نے کہا یہ کیونکر؟ فرمایا وہ یوں، کہ اگر تم ابوبکر سے موالات رکھتے ہو تو ان کے دشمنوں سے نفرت ضرور کرو گے خواہ کوئی بھی ہوں۔ اسی طرح عمر بن خطاب

کو دوست رکھو گے تو ان کے دشمنوں سے برائت کرو گے جو بھی ہوں اسی طرح عثمان سے محبت رکھتے ہو تو ان کے دشمنوں سے تبرّہ کرو گے وہ جو بھی ہوں مگر جب حضرت علی ابن طالبؑ کی بات آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم ان کو دوست تو رکھتے ہیں مگر ان کے دشمنوں سے برائت نہیں کرتے آخر یہ ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے ؟

اس مناظرہ کے علاوہ اور کہیں ان مناظرات میں شیخین کا ذکر نہیں ہے۔

چوتھی بات لکھا ہے کہ کشف الغمہ میں امام جعفرؑ کا یہ قول درج ہے :-

ایک سپاہی یا معمولی فوجی افسر جس کا میدانِ جنگ سے ہٹنا اسلام کے مرکزی اقتدار کو کوئی اساسی صدمہ نہیں پہنچا سکتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ شخصیت دنیا میں اہمیت حاصل کر چکی تھی اور تمام مسلمانوں کے حاکمِ اعلیٰ اور مرکزی حکومت اسلام کے سربراہ کی حیثیت سے متعارف تھی۔ جو اصولی طور پر کتنی غلط ہو۔ مگر غیر مسلم دنیا کی نظر میں بہر حال وہ ایک تاریخی واقعیت تھی۔ لہٰذا اس وقت ایسی کوئی صورت پیش آنا وقارِ اسلام کے لیے بڑی مہلک ضرب تھی۔ اسی پہلو کو حضرت امیرؑ نے نہایت مستحسن الفاظ میں پیش فرمایا۔ اور اس طرح کہ جناب خلیفہ دوم کو بھی موقع کی نزاکت کا احساس ہو گیا اور انھوں نے بھی کسی پر خود غلط زعمِ شجاعت سے کام نہ لیتے ہوئے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

یہاں یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ متفق علیہ حدیث رسول ہے کہ المستشار موتمن جس سے ظاہر ہے کہ مشورہ لینا بھی ایک امانت کا سپرد کرنا ہے اور امانداری

وہ چیز ہے کہ بعد بعثت بھی ہجرت کے قبل تک مشرکین کی امانتیں حضرت پیغمبر خدا کے پاس موجود تھیں مگر اس سے یہ تو ثابت نہیں ہو سکتا کہ آپ کو مشرکین سے کوئی اصولی اختلاف نہ تھا۔ یا یہ کہ مشرکین سے آپ کو کوئی صدمہ نہ پہنچا تھا۔ پھر اگر مشرکین کے لیے امانداری سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کے تعلقات کا خوشگوار ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ تو ان کے حقیقی جانشین حضرت علی ابن ابی طالبؑ کا کسی کے ساتھ امانت داری کے فریضہ کو انجام دینا ان کی باہمی تعلقات کی خوشگواری کا ثبوت کیوں کر ہو سکتا ہے؟

یہاں کافی کی ایک حدیث بھی کافی اہمیت رکھتی ہے۔

قال ابو عبد اللہ فی وصیۃ اعلم ان ضارب علی بالسیف وقاتلہ لو ائتمننی واستنصحنی و استشارنی ثم قبلت ذالک لادیت الیہ امانتہ۔

حضرت امام جعفر صادقؑ نے اپنی ایک وصیت کے ذیل میں فرمایا یہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت علیؑ کو تلوار لگانے والا اور آپ کا قاتل ابن ملجم بھی اگر مجھے امین قرار دے اور مجھ سے نصیحت چاہے اور مشورہ طلب کرے اور میں اسے مشورہ دینا منظور کر لوں تو میں اس کے لیے بھی امانداری اپنا فریضہ سمجھوں گا۔ من لم یقل لہ الصدیق فلا صدق اللہ قولہ فی الدنیا والآخرۃ — جو شخص ابوبکر کو سچا نہ سمجھے خدا اسے دنیا و آخرت میں جھوٹا کرے۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ ہماری ان کتابوں میں جیسے کشف الغمہ ہے۔ عموماً روایات اہل سنت کے کتب سے ماخوذ ہیں۔ اس لیے اس مقالہ کی کسی گذشتہ قسط میں ہم نے لکھا ہے کہ بعض روایتیں ایسی

آگئی ہیں کہ جو کسی اعتبار سے ہمارے خلاف استعمال کی جاتی ہیں اور بعض علماء ان پر ملتفت نہیں ہونے اور بعض نے اس کا مفہوم اور کچھ قرار دیا۔ اور کشف الغمہ میں تو دیباچہ میں لکھ دیا ہے کہ :۔ اعتمدت فی الغالب النقل من کتب الجمہور میں نے زیادہ تر سنیوں کی کتابوں سے مضامین نقل کیے ہیں اس لیے ہو سکتا تھا کہ مذکورہ قول کشف الغمہ میں کہیں پر ہوتا ہم نے اسے تلاش کیا تو ظاہر ہے کہ یہ قول یا تو خلیفہ اول ابوبکر کے حالات میں ہوتا تو وہ اس کتاب میں سرے سے ہے ہی نہیں کیونکہ یہ کتاب چہاردہ معصومین کے حالات میں ہے خلفاء کے حالات میں نہیں ہے یا پھر امام جعفر صادق کے حالات میں اسے ہونا چاہیئے جو اس کتاب کے طہرانی چھاپے میں صفحہ ۲۲۲ سے صفحہ ۲۴۱ تک ہیں مگر اسے کیا کیا جائے کہ ان میں بھی ہم کو تلاش سے یہ فقرہ نہیں ملا۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اس کتاب میں کہاں ہو سکتا ہے؟

پانچویں بات حضرت عمر نے غزوۂ روم و فارس میں خود بنفس نفیس جانے کے لیے حضرت علی سے مشورہ کیا تو آپ نے منع فرمایا جس کا نہج البلاغہ میں تذکرہ ہے۔ اس پر ہم نے ایک مقالہ میں جو امامیہ مشن لکھنؤ کی طرف سے شائع ہو چکا ہے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی بلند نفس کے اختلاف کو اپنی لیست ذہنیت کے معیار پر جانچنا نہیں چاہیئے کہ جس سے ہم خفا ہیں پھر چاہے اس ذیل میں کسی بلند مقصد کو نقصان بھی پہنچ جائے مگر اس شخص کے ساتھ ہر معاملہ میں ہم اس رنجش اور نزاع کو دخل ضرور دیں گے۔ بلند نفوس کے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ حضرت علی کے سامنے مفادِ اسلام

اور وقارِ اسلام کا سوال رہتا تھا۔ خلیفۂ دوم نے روم اور فارس جانے کا مشورہ لیا تو سوال یہاں فقط خلیفۂ دوم کی زندگی کے خطرہ میں پڑنے کا نہ تھا بلکہ وقارِ اسلامی کا سوال تھا کیونکہ اُحد وغیرہ کے تجربات سامنے تھے مگر اس وقت اس شخص کی حیثیت جو موضوعِ کلام ہے (فروع کافی ج ا مطبوعہ طہران ص ۳۶۵)

اس سے حضرت امیرؑ کے کردار کی بھی پوری شرح ہو جاتی ہے جس کے بعد کچھ روشنی ڈالنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

چھٹی بات کہا جاتا ہے کہ ایران کے شہنشاہ یزدجرد کی بیٹی جناب شہر بانو عہد خلیفۂ دوم میں گرفتار ہو کر آئی تھیں جنہیں خلیفۂ دوم نے حضرت علیؑ کے صاحبزادے حضرت امام حسینؑ کے سپرد فرمایا۔ یہ اس کا واضح ثبوت ہے کہ ان بزرگوں کے باہمی تعلقات بے حد خوشگوار تھے۔

حالانکہ اسکی اصل بنیاد یعنی اس واقعہ کا عہدِ عمر میں ہونا ہی مسلّم نہیں ہے بلکہ دوسری روایت جو درایتہً صحیح معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ یہ خود حضرت علیؑ کے عہد کا واقعہ ہے اس کے علاوہ جس روایت میں عہد حضرت عمر میں اس واقعہ کا ہونا مذکور ہے اس میں یہ ہے کہ خود جناب شہر بانو نے حضرت امام حسینؑ کو منتخب کیا اور اصولی اختلافات کے باوجود یہ تو مسلّم ہے کہ حضرت علیؑ اکثر اس دور میں مفادِ اسلام کے پیش نظر مشورے دیا کرتے تھے چنانچہ یہ امر کہ شہر بانو کو باختیار خود شوہر منتخب کرنے کی اجازت دی جائے حضرت امیرؑ کے مشورے سے پہلے ہی طے پا چکا تھا۔ یہ مشورے باہمی تعلقات کی بالکلیہ خوشگواری کی دلیل نہیں ہیں۔ اس پر ابھی تبصرہ روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

والسلام

امامیہ مشن پاکستان

(تعلیمی پریس لکھنؤ)